

فطائیت اور اس کی ستمنائیاں

(عبد الحمید)

(۲)

فاشترم، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے ریاست اور قومیت کے وجود کو ہی اصل قرار دے کر سامے انسانوں کو انہی کی توسیع و استحکام کے لیے استعمال کرنے کا داعیہ رکھتا ہے۔ اُس کا دعویٰ یہ ہے کہ زندگی کی تمام قدروں کی تخلیق و تکوین صرف ریاست ہی کے توسط سے عمل میں آتی ہے۔ اسی ”عظیم“ کی غیر مشروط اطاعت سے زندگی میں استواری پیدا ہوتی ہے۔ یہ وہ ”ذات“ ہے جو زندگی کے نظم و ربط کا مرکزی نقطہ ہے۔ اسی نقطہ کے گرد انسانی شخصیت اپنا استحکام و تحفظ تلاش کرتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فاشترم کن کن ذرائع کو استعمال میں لا کر ان مقاصد کو حل کرتا ہے۔

اگر اس تحریک کے مزاج کا ایک سرسری سا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس میں سامانِ عدوانسانی جذبات کو بھڑکانے پر صرف کیا جاتا ہے۔ اس کے سربراہ اور کارپرداز عوام پر کسی عقلی نصب العین اور علمی دلائل کے زور سے اثر انداز ہونے کے بجائے اس کا اہتمام کرتے ہیں کہ لوگوں کے جذبات کو زیادہ سے زیادہ براگھنچتہ کیا جائے۔ ریاست کا پورا نظام اور اجتماعی زندگی کے سامے کارخانے انہی کی قوت سے چلتے ہیں۔ عقل مند اور معتدل مزاج انسانوں کی یہاں کوئی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی، دانشمند مدیرین اور دماغی توازن قائم رکھنے والے کارکن اس میں کسی طرح کھپ نہیں سکتے۔ یہاں مقبولیت اُن انشخاص کو حاصل ہوتی ہے جنہیں عقل سے بعد اور جذبات سے محبت ہو، جو قوم کو سستے نعروں کی بو میں بہست کر کے اسے دشمن سے لڑا دیں، جو اپنے طرزِ عمل کی غلطی کو کسی پر واضح نہ ہونے دیں۔ الغرض جو ہوش سے زیادہ جوش سے کام لینے کے عادی ہوں۔ پروفیسر NELVIN RADER نے اپنی تصنیف

میں ایک باب عقلیت سے فرار (THE FLIGHT FROM REASON)

NO COMPROMISE

کے نام سے لکھا ہے۔ اس میں اُس نے بڑی تفصیل کے ساتھ اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ کس طرح فسطائی فلسفہ لوگوں کو ٹھوس حقائق سے ہٹا کر انہیں ہوائی قلعوں کے اندر مقید کر دیتا ہے۔ وہ لوگوں کو ایسے طلسم میں گرفتار کرتا ہے جس کے زیر اثر وہ آنکھوں کے باوجود اندھے ہوتے ہیں، کانوں کے باوجود کچھ سننے نہیں پاتے اور دماغ کی موجودگی میں بھی عقل و خرد سے یکسر عاری ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کا مقصد صرف اسی قدر سمجھتے ہیں کہ بالکل آنکھیں بند کر کے حکمراں گروہ کے اشاروں پر چلتے رہیں۔ فاضل مصنف کے حوالہ سے ایک عبارت نقل کرتا ہے:-

JAMES DRENNAN

”فاٹرم ہی اصل قیامت ہے۔ یہ احساسات کا انقلاب ہے۔ یہ جدید دنیا کے خلاف انسان کا غدر ہے۔ فسطائیت کی غالباً اسی خصوصیت کا نتیجہ ہے کہ یہ تحریک بغیر کسی نظریہ، اور واضح پروگرام کے اٹلی اور جرمنی میں سرعت کے ساتھ پھیل گئی۔“

اسی طرح مسولینی بڑے فخر کے ساتھ اس حقیقت کا یوں اعتراف کرتا ہے:-

”دہاں بڑی ہی گرم بجلی ہوئیں، لیکن آخر کو کسی چیز زیادہ اہم اور مقدس تھی۔ صرف یہ کہ انسان موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ وہ مرنا جانتے تھے۔ ہمارے پاس نظریہ اور فکر کی کمی ہے، مگر اس کی جگہ ہم ایک اور موثر چیز لے آئے ہیں، وہ ہے اعتقاد۔“

MARGHERITA

مسولینی کا سرکاری سوانح نگار اپنے ہیرو کی ذہنی کیفیات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ عظیم شخصیت صرف جذبات کے بل بوتے پر کام کرنا جانتی تھی۔ کوئی عقلی دلیل کوئی علمی مشورہ اُسے قبول نہ ہوتا۔ وہ انہی لوگوں کو پسند کرتا جو اُس کے منہ سے نکلی ہوئی ہر بات کو بلاتامل سنتے اور پھر بغیر کسی پس و پیش کے اطاعت کرتے۔ وہ جن چیزوں کو حق سمجھتا لوگ بھی انہیں اسی طرح مانتے۔ غرضیکہ دنیا کی ساری حقیقتوں کو اس کی خواہشات کے مطابق ڈھلنے ہی میں اپنی سب سے بڑی سعادت خیال کرتے۔ یہ شخص بھی اپنے فکر و شعور کی قوتوں سے زیادہ کام لینا پسند نہ کرتا، بلکہ محض اپنے جلی دایعات کی رہنمائی میں اپنا لائحہ عمل تیار کرتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:-

”میرا خون مجھے بتاتا ہے، مجھے اپنے خون کی آواز کو سننا چاہیے۔ یہ ہیں وہ نعرے جن سے یہ

سیاست دان اپنے مسائل حل کرتا۔ وہ کہتا کہ میں جانوروں کی طرح ہوں۔ جب کوئی واقعہ معرض وجود میں آنے والا ہو تو میں اُسے محسوس کرتا ہوں مجھے میری جبلت آگاہ کرتی ہے اور میں اسی کی پیروی کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں۔

ہم نے اپنا پیکر خیال تخلیق کر لیا ہے اور یہ ہمارا اعتقاد اور جذبہ ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ حقیقت بھی ہو۔ اس کی اصلیت صرف اسی قدر ہے کہ یہ ہمیں سرگرم عمل کرتا ہے، اور ہم میں بہت واسنقلال پیدا کرتا ہے!

غالباً یہ جذبات کی اسی حکمرانی کا اعجاز ہے کہ اس تحریک کی نشوونما ہمیشہ غیر معقول، مگر بڑے ہی نمائشی اور جذباتی نعروں کی فضا میں ہوئی ہے۔ قوم میں نسلی تفوق کے جذبہ کو پاگل پن کی حد تک ابھارنا پھر قومی نسلی عظمت کے نام پر لوگوں کو ہر وقت دوسروں کے خلاف صف آرا کرتے رہنا اسی جذبات پرستی کا شاخسانہ ہیں۔ الفرڈ روزن برگ ALFRED ROSENBERG نازی تصوریات کے سرکاری ترجمان نے اسی کی وضاحت میں لکھا ہے :-

”ہمارا بنیادی تصوریہ ہے کہ ہماری قوم عظیم ترین ہے، اور اسی کو منوانے کے لیے ہم پوری طرح جدوجہد کر رہے ہیں۔“

”ہمارا اس بات پر ایمان ہے کہ اس کائنات کو تین مختلف ذرائع سے سمجھا جاسکتا ہے۔ احساس کی مدد سے یا ارادہ اور عقل کے ذریعے۔۔۔۔۔ ان سب کو ایک ہی عقیدہ جنم دیتا ہے اور وہ ہے نسلی تفوق۔“

نازی ادب میں ”خون“ کے استعارہ کو جس کثرت سے دہرایا گیا ہے وہ نازی فلسفہ حیات اور اس کے مضمرات کی نوعیت سمجھنے کے لیے بالکل کافی ہے۔ خون، جنگ و جدال، قتل و غارت، تباہی و بربادی کا نشان ہے۔ اس کی حیثیت فسطائی طرز فکر میں وہی ہے جو مذہبی ادب میں ”روح“ کی ہوتی ہے۔ نازی مذہب میں ”خون“ ایک اساسی اور بنیادی قدر کے طور پر شامل ہے۔ اس پر ایمان رکھنے والوں کا عقیدہ ہے کہ تصورات کو صرف حیاتیاتی عوامل ہی جنم دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فسطائی پروگرام

میں سب سے زیادہ اہمیت جنگ کو حاصل ہے۔ ٹھیکر نے اپنی کتاب ”میسری جدوجہد“ (MYSTRUGGLE) میں اس حقیقت کا مندرجہ ذیل الفاظ میں اعتراف کیا ہے:-

”کوئی اتحاد جس میں جنگ کی نیت شامل نہ ہو، وہ بالکل بیکار اور فضول ہے“

۱۹۱۲ء میں جب مسولینی نے اپنا سب سے پہلا سرکاری ترجمان (POPULO D'ITALIA) جاری کیا تو اس میں جنگ کی بے حد مدح و ستائش کی گئی۔ اس سلسلہ میں یہاں چند اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر اس امر کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ فاشزم کے حامیوں کے نزدیک جنگ کتنی اہم اور ضروری ہے اور اس کے شعلے بھڑکانے کے لیے کتنے اشتیاق کا اظہار کیا جاتا ہے۔ مسولینی اس اخبار میں لکھتا ہے:-

”اے جنگ خوش آمدید! کیا مجھے یہ نعرہ بلند کرنے کی اجازت ہے۔ تین بارمرجائے اٹلی کی جنگ! تو دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز اور حسین ہے۔ اور بھلا ہو عام جنگ کا.....“ (۱۹۱۳ء)

”امن ایک فضول سی چیز ہے“ (۱۹۲۱ء)

”میں اطالوی قوم کو مستقل جنگی حالت میں تصور کرتا ہوں۔ میں نے پہلے بھی اس امر کا اظہار کیا ہے اور پھر اس بات کو دہراتا ہوں کہ آگے پانچ یا دس سال ہمارے لیے فیصلہ کن ہیں۔“ (۱۹۲۶ء)

”ہم میں یہ صلاحیت ہونی چاہیے کہ پچاس لاکھ افراد کو چشم زدن میں مسلح کر کے جنگ کی آگ میں جھونگ سکیں۔ ہمیں اپنی بحری اور ہوائی طاقت کو زیادہ سے زیادہ مضبوط بنانا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہماری یہ قوت اس قدر زیادہ ہو کہ جنگی گاڑیوں کی آوازیں اس سرزمین کی دوسری ساری آوازوں کو دبا دیں، اور جہازوں کے پر سورج کو چھپالیں۔“

یہ اسی طرز فکر کا نتیجہ تھا کہ اٹلی اور جرمنی کی سرزمین شعلہ جوالہ بن گئی اور اس پر آباد ہونے والے آدم زاد بھیر لویں کی طرح کمزوروں پر حملہ آور ہوئے۔ ان کی ”قوت پرستی“ اپنی مداخلت کے لیے نہ تھی بلکہ اُس کا مقصد یہ تھا کہ اپنی قوم کے لیے دنیا کی ”شکار گاہوں“ سے زیادہ سے زیادہ شکار حاصل کرنے کا سامان کیا جائے۔ اس غرض کے لیے وہ نہ صرف دنیا میں پھیل جانا چاہتے تھے، بلکہ اُن کے

پیش نظر دنیا کے سائے افراد کو غلام بنانا بھی تھا۔ جارحانہ وطنیت، یا امپیرلزم اسی احساس کی کرشمہ سازی ہے۔ جن لوگوں نے امت مذہب کا کلمہ پڑھا ہے وہ اسے اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں کہ دنیا کی ساری اقوام پر حکمرانی اور فرمانروائی کریں دنیا اور اس کے سارے ذرائع کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کریں، اور ملکیت اور استعمار کے نشہ میں بند کابن خدا کو بھیر کسی رکاوٹ کے ہلاک کرتے رہیں۔ مسو یعنی اس نظریہ کو زندگی کا ایک ابدی اور ناقابل تغیر اصول سمجھا ہے۔ اپنے اس جارحانہ اقدام کے لیے باسوم زمبر جو ان پر پیش کی جاتی ہے کہ ہم تعداد میں زیادہ ہیں اور ہمارے ملک کی وسعت کم ہے۔ اس لیے ہم اس بات پر مجبور ہیں کہ اپنے پڑوسی ممالک کو زیر کر کے وہاں اپنی قوم کے افراد کو بسا دیں۔ مسو یعنی نے یہی دلیل پیش کرتے ہوئے کہا:-

”ہماری آبادی چار کروڑ افراد پر مشتمل ہے جو ایک چھوٹے سے ملک میں محصور ہے۔ ہمارے ملک اٹلی کے آس پاس کئی ایسے ممالک ہیں جن کی آبادی ہمارے مقابلے میں بہت کم ہے مگر ان کا قبہ ہم سے دو گنا ہے۔ ظاہر ہے کہ اطالوی قوم کو پھیلنے کے سوا اب کوئی چارہ نہیں۔“

آپ مندرجہ بالا الفاظ پر غور کریں اور پھر اندازہ لگائیں کہ یہ بیان سرمایہ دارانہ جمہوریت کے علمبرداروں کے جارحانہ غرائم سے کہاں تک مختلف ہے۔ جس طرح سرمایہ دار ممالک ”قومی دولت“ میں اضافہ کرنے کے لیے اپنے ملک کے افراد کو روزگار بہم پہنچانے کے لیے اپنے کارخانوں کو خام مال مہیا کرنے کے لیے اور پھر پیدا شدہ مال سے بے کس اور کمزور قوموں کو تالا مال کرنے کی غرض سے نئی نئی منڈیوں کی تلاش پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں، اسی طرح فسطائیت کے حامی بھی اپنی ملکی حدود کو پھیلانے کا غم رکھتے ہیں۔ انہیں ہمیشہ اس بات کی فکر رہتی ہے کہ نئے نئے علاقوں کو فتح کریں، اُن پر کمزوروں کے خون سے رنگے ہوئے پھر یہیے اُڑائیں۔ ان کے ذہن میں صرف ایک ہی جذبہ کارفرما ہوتا ہے کہ اپنے اقتدار کو ہر آن وسیع کرتے چلے جائیں، خواہ خدا کی بے بس مخلوق پر کچھ بھی گزرے۔

فاشزم کے دعویٰ بلاشبہ بلند بانگ ہیں۔ جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے وہ بیشک سرمایہ دارانہ نظام اور اس کی اُن لغتوں کو جو اس نے دنیا پر مسلط کر رکھی ہیں، ختم کرنے کا غم رکھتا ہے مگر جب

ہم اس تحریک کو سطح سے نیچے دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض ایک نقاب ہے جس کی اوٹ میں سرمایہ داروں کی طرح ہی اپنی ہوا دہوس کی تسکین کا سامان ہم پہنچایا جاتا ہے۔ اس نئے ”ازم“ کے پرستاروں نے اپنے پیشرووں کی طرح قدرِ حریت اور شرفِ انسانیت کو ایسا پامال کیا ہے کہ تاریخِ انسانی اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ یہ لوگ جنہیں جمہوریت کی چیرہ دستیوں کو ٹٹلنے کا دعویٰ تھا جب خود انسانوں کے قائدین بنے تو اپنے اعمال سے خود نریزی، سفاکی، اور زبردستی آزادی کے دیوتا ثابت ہوئے۔ ان کے سامنے کوئی اخلاقی مقصد نہ تھا۔ بلکہ صرف ”جوع الارض“ کی تسکین تھی۔ اس مقصد کے حاصل کرنے کے لیے انہوں نے نہ صرف کمزوروں کی آزادیوں پر ڈاکہ ڈالا بلکہ ان کے اخلاق، مذہب، ان کی معاشرتی روایات، ان کے ادب اور ان کے اموال پر دستِ تطلاب دراز کیا۔ پھر اپنے اس ظالمانہ اور ناجائز تسلط کو دیر تک قائم رکھنے کے لیے ان بد بختوں کو خوں ریزی اور برادر کشی میں مصروف کر دیا تاکہ وہ اقبال مرحوم کے الفاظ میں ”غلامی کی افیون سے مدہوش و غافل رہیں اور استعماری جونک چپ چاپ ان کا لہو چاٹتی رہے“